مذاکرہ

دینی مدارس کا نظامِ تعلیم

مرتبہ: خرم مراد

نئی صلیبی جنگ، دینی مدارس کے دروازوں پر (مئی ۹۵) میں ہم نے مدارس کے خلاف حکومت پاکستان اور مغربی حکومتوں کی مہم اور اس کے اسباب کا مختصر جائزہ پیش کیا تھا۔ ملت کی طرح مدارس بھی بظاہر اس معرکہ آرائی کے لیے تیار نظر نہیں آتے۔ ہر دردمند صاحبِ نظر جانتا ہے کہ دونوں ایک زبردست قوتِ اجتہاد و جہاد کے ذریعے اصلاح، تغیر و تبدل اور تعمیرِ نو کر کے ہی اس معرکے میں کامیابی کی توقع کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے، مدارس میں تغیر و اصلاح کے موضوع پر ہم قدیم و جدید علما و مفکرین کے افکار کو ایک مذاکرے کی صورت میں مرتب کر کے قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہ اعتراف ضروری ہے کہ مختصر سے صفحات میں ایک مذاکرہ، جامع نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی کہ اس مذاکرے میں بیش تر بحث کا محور نصابِ تعلیم ہے، جبکہ نظامِ تعلیم کے دوسرے پہلو بھی اہم ہیں۔ (مدیر)

۱ - مولانا قاسم نانوتوی: ترجمانی، سید مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، ج ۲

حد سے زیادہ تاریک اور مہیب مستقبل کا، جس سے اچانک سرزمینِ ہند میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دوچار ہوگئی تھی، مقابلہ کرنے کے لیے جو میدان میں اترا تھا، وہ جو کچھ ہو سکا کر گزرا۔ یوں اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک مستقل دینی و علمی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔ اپنے بانی کے نام کی نسبت سے اس کی تعبیر چاہے کہ "قاسمیت" کے نام سے کی جائے۔

دینی تعلیم کا مستقل نظام، اس تحریک کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے، جس کی بنیاد دارالعلوم دیوبند پر قائم ہے۔ مگر جس تعلیمی نظام سے مغرب نے دنیا کو روشناس کرایا ہے، اس میں سے جماعت بندی، امتحان، خصوصاً تحریری امتحان، طلبہ کی حاضری کے رجسٹر اور ازیں قبیل دوسرے لوازم و خواص کے ایک بڑے حصے کو اس دارالعلوم میں نہ صرف قبول کر لیا گیا ہے، بلکہ پوری قوت و احتیاط کے ساتھ

تعلیم کی ان جدید خصوصیات کی نگرانی بھی کی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ دیوبند میں عصری یونی ورسٹیوں کی خصوصیات کے شریک ہونے کے اسباب کیا ہوئے؟ کیونکہ مسلمانوں میں تعلیم کا جو طریقہ مروج تھا' اس میں ہم ان جدید خصوصیتوں کو نہیں پاتے ' افادیت اور عدم افادیت کی بحث جداگانہ ہے۔

[جہاں تک میرا خیال ہے]' ہندستان کی نئی حکومت نے جو عربک کالج دلی میں قائم کیا' اس کے صدر مولانا مملوک العلی سے بانی دارالعلوم نے تعلیم حاصل کی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی' اور ان کو دینی زندگی سے منحرف کرنے کی کوششوں کے مقابلے کے لیے دینی علوم کی عمومیت کے لیے کیا کرنا چاہیے' اور نئے حالات کی رو سے تعلیم وتدریس کے نظام میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے' ان مسائل کے حل کے لیے دلی عربک کالج کے ماحول میں ''نظریات'' کو ''عملی قالب'' میں دیکھنے کے مواقع آپ کو ملے۔ ایسی صورت میں' کوئی وجہ نہ تھی کہ اجتماعی درس وتدریس کے جس طریقے کا آپ مشاہدہ فرما رہے تھے' اس سے استفادے کی تدبیریں آپ کے دماغ میں نہ آئی ہوں۔

حضرت نے بطور وصیت نامے کے ان بنیادی اصولوں کو قلم بند فرمایا جن پر آپ نے اس دارالعلوم کی بنیاد قائم فرمائی تھی' اور وصیت فرمائی کہ آیندہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں دارالعلوم کے نظم ونسق کی باگ آئے' وہ ان اصولوں کی روح کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔

اسی تحریر خاص میں ایک دفعہ ان الفاظ میں بھی ہے کہ ''دارالعلوم کا تعلق عام مسلمانوں سے زائد سے زائد ہو' تاکہ یہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کرے' جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو''۔ گویا دارالعلوم کا مسلمانوں سے ''جمہوری تعلق ہو' جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے''۔ اسی بنیاد پر آپ آمدنی کے کسی مستقل ذریعے کے قائم کرنے کے خلاف تھے کہ' حکومت یا کسی رئیس کی دوامی امداد' یا مستقل جائداد' کی صورت میں عام مسلمانوں سے احتیاجی رشتہ دارالعلوم کا باقی نہ رہے گا۔

اسی طرح' دینی زندگی کی حفاظت کے لیے اس جدید تعلیمی نظام میں' حضرت کے نزدیک' ہمارے قدیم علما کی تدریس وتعلیم کا انفرادی طریقہ قطعاً ناکافی تھا' اور مشاہدے سے اس کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ فرمایا کہ' کیفیت میں ترقی تو اسی طریقے سے ہوتی ہے' لیکن علم کی وسعت اور علما کی تعداد بڑھانے کی واحد صورت یہی ہے کہ درس وتعلیم کے اجتماعی طریقے کو اختیار کیا جائے۔ اس لیے آپ ایسا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں حتی الوسع تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی سمونے کی صورت نکالی جائے۔

جس زمانے میں [آپ ان نظریات کے لیے جگہ ڈھونڈ رہے تھے]' آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے

کہ ہمارے قدیم علما کے لیے ان چیزوں ہی کی نہیں بلکہ ان کے تصور کی بھی کیا نوعیت تھی۔ ان مولویوں کے نزدیک علم کی کیفیت کا مسئلہ تھا' جبکہ آپ کے لیے کیفیت سے زیادہ کمیت اور مقدار کا مسئلہ اہم تھا۔

نظام تعلیم میں سب سے پہلا مسئلہ نصاب تعلیم کا ہے۔ جو کچھ پڑھا پڑھایا جاتا ہے اس کو دیکھ کر عام رائے یہی قائم ہو سکتی ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں نصاب تعلیم کے مسئلے پر شاید کبھی غور نہیں کیا گیا' من و عن درس نظامیہ کا نصاب قبول کر لیا گیا' اور زمانے کے جدید تقاضوں کی طرف سے چشم پوشی اختیار کی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ جو دیکھا جا رہا ہے اس کو دیکھ کر کہنے والے آخر اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ لیکن حضرت کا نقطہ نظر اس باب میں کیا تھا؟ اس کو پیش کرنے سے پہلے چاہیے کہ ایک بات سمجھ لی جائے۔

تعلیمی نصاب کے متعلق سب سے زیادہ اہم سوال یہی ہے کہ یورپ کے جن جدید علوم و فنون اور زبانوں سے آگاہی حاصل کیے بغیر عصر حاضر میں امتیاز و وقار حاصل نہیں کیا جا سکتا' ان کا پیوند دینی علوم سے کیسے قائم کیا جائے۔

اب تو علما کی اکثریت اس سوال کی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہے' لیکن اس مسئلے کا حل پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی کتابیں بھی نصاب میں شریک کرنی چاہئیں؟ یا جدید علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد اسلامی علوم کے سیکھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ایک تیسرا احتمال بھی ہے۔ یعنی پہلے مسلمان بچوں کو دینی علوم سے کم از کم وقت میں قدر ضرورت کی حد تک واقف بنا لینے کے بعد ان کو جدید علوم و فنون کی یونی ورسٹیوں میں شریک کیا جائے۔

اب دیکھیے کہ حضرت کا زاویہ نگاہ اس باب میں کیا تھا:

فارغ طلبہ کو سند و انعام دینے کے لیے ۹ جنوری ۱۸۷۴ کو ایک جلسہ دیوبند میں منعقد ہوا تھا۔ ''کانووکیشن'' طرز کا یہ جلسہ تھا۔ ایک خصوصیت اس جلسے کی یہ بھی نظر آئی کہ فارغ ہونے والے طلبہ سے علم کے کسی خاص موضوع پر امتحانی مقالے لکھوائے گئے تھے۔ یعنی یونی ورسٹیوں کے آخری مدارج میں جیسے مقالے لکھوائے جاتے ہیں' دارالعلوم میں تقریباً ایک صدی پہلے یہ سنت جاری ہو چکی تھی' جو افسوس ہے کہ بعد کو جاری نہ رہی۔

اسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ درباب تحصیل' یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا۔ یعنی' علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا گیا۔ منجملہ دیگر اسباب کے' بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو' یا خاص' اس پہلو کا لحاظ چاہیے جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔ سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم

علومِ جدیدہ تو بوجہ کثرتِ مدارسِ سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطینِ زمانۂ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی۔ ہاں 'علومِ نقلیہ (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانے میں نہ ہوا ہو گا۔ ایسے وقت میں رعایا کو مدارسِ علوم جدیدہ کا بنانا تحصیلِ حاصل نظر آیا۔ لہٰذا صرف بجانب علومِ نقلی (یعنی خالص اسلامی و دینی علوم)' اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے' (انعطاف) ضروری سمجھا گیا"۔

یعنی' مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے' اور نئی حکومت جن علوم کی سرپرستی سے صرف دست بردار ہی نہیں ہوگئی بلکہ اس کے پیدا کیے ہوئے ماحول میں وہ زبونی کے آخری حدود تک پہنچ چکے ہیں' ان علوم کے احیا و بقا کا انتظام رعایا کی مالی امداد سے کیا جائے۔

خصوصی توجہ کا مستحق توجیہ کا دوسرا پہلو ہے۔ فرمایا کہ اس طرح "استعدادِ علومِ جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے"۔ یعنی' مروجہ نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں علوم جدیدہ کے حاصل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا علومِ جدیدہ کی تعلیم کا مقدمہ بھی دینی تعلیم کا نصاب بن سکتا ہے۔ آگے نصاب میں علومِ نقلیہ اور علومِ دانش مندی کو داخل کرنے کا ذکر کرتے ہوئے' اپنے صحیح تعلیمی نصب العین کو حضرت نے واضح فرما دیا ہے: "اس کے بعد اگر طلبہ مدرسہ ہذا' مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مُؤید ثابت ہوگی"۔

غم و غصہ اور دل افگاری کے ان ایام میں' جب مسلمانوں کو ہندستان جیسی اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کر کے غلام بنا لیا گیا تھا' ان کے قلوب میں قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی تھی جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے' ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی فطرتاً اس سے مسلمان بھڑکتے تھے' انگریزی مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا اس کے تصور سے بھی وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ اسی ماحول میں حضرت یہی نہیں کہ انگریزی مدارس میں داخل ہو کر تعلیم پانے کے جواز کا فتویٰ دے رہے ہیں' بلکہ بغیر کسی جھجک کے مولویوں کی بھری ہوئی مجلس میں اعلان فرما رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہو کر علوم جدیدہ کی تعلیم' علمی کمالات کے چمکانے اور آگے بڑھانے میں مولویوں کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

اللہ اللہ' ایک طرف اسی زمانہ میں مولویوں کی اکثریت یہ باور کیے بیٹھی تھی کہ جو کچھ انھوں نے پڑھ لیا ہے' اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جسے سیکھا اور پڑھا جائے۔ دوسری طرف' ان ہی مولویوں کے درمیان' پکارنے والا پکار رہا ہے کہ مولویوں میں جو اپنے علمی کمالات میں مزید فروغ اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہتا ہے' چاہیے کہ یورپ کے جدید علوم کا مطالعہ کرے اور ان کی علمی

زبانوں کو سیکھے ۔ یقیناً حضرت والا کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے ۔ یورپ کے جدید علوم و فنون کی اہمیت و ضرورت کا انکار اس زمانے میں عموماً ہمارے علما نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ مگر دیوبندی نظام تعلیم کے امام اول و اکبر نے ٹھیک وقت پر ان جدید عصری علوم کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ بلکہ حضرت کے الفاظ سے آگاہ ہونے کے بعد بلاخوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنا تعلیمی نظریہ یہی پیش کیا ہے ' کہ پہلے دینی و اسلامی علوم کا نصاب ' دانش مندی کے فنون کے ساتھ ' ختم کر الیا جائے ' اس کے بعد علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کو داخل کیا جائے ۔

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے اپنے ہی زمانے میں تعلیم کے تمام پہلوؤں اور ان کے مختلف نتائج کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ حکومت مسلّطہ کی امداد کی طرف غلطی سے بھی آپ دیکھنا شاید پسند نہیں فرماتے تھے ' لیکن قدیم و جدید علوم کے پیوند کی مجوزہ ترتیب کی افادیت کے خیال نے اس حد کے توڑنے پر بھی آپ کو شاید مضطر و مجبور کر دیا تھا۔ سب سے بڑی رکاوٹ آپ کی تجویز کے عملی نفاذ میں میٹرک کے امتحان کے لیے عمر کی قید تھی ۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے حکومت کو پکارا ہے: ''کاش 'گورنمنٹ ہند بھی قید عمر طلبہ نو داخل کو اڑا دے''۔

شروع میں مدرسے کی تعلیمی مدت دس سال مقرر کی گئی تھی ۔ لیکن دو سال گزرنے کے بعد ' نصاب اور تعلیمی مدت وغیرہ پر نظر ثانی کرنے کے لیے ایک مجلس مقرر کی گئی ۔ اس نے یہ ایک تجویز پیش کی کہ تمام کتب کے لیے چھ سال کی مدت مقرر کی جائے ۔ یعنی حدیث و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و فرائض کی وہ ساری کتابیں ختم ہو جائیں جن کے پڑھنے پڑھانے کا عام رواج اس زمانے میں تھا۔ دس سال کی عمر میں اس شش سالہ نصاب کو شروع کر کے سولہویں سال میں پڑھنے والے اس کو ختم کر سکتے تھے ' اور جدید علوم اور نئی علمی زبانوں کو سیکھ کر بائیس تیئس سال کی عمر میں گریجویٹ بن جانے کا کافی موقع پیدا کر دیا گیا تھا۔ یعنی حضرت کی مجوزہ ترتیب کے مطابق باضابطہ مولوی اور مستند گریجویٹ بن جانے کا وقوعی امکان مسلمانوں کے سامنے آ گیا تھا۔

صحیح طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ اس تعلیمی نصب العین کے مطابق آیندہ عمل در آمد کی راہوں میں کیا رکاوٹیں پیش آئیں کہ اس قیمتی امکان سے مستفید ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ پچاس سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کی اجل مُسمّی پوری ہو گئی ۔ اور میرا خیال تو یہی ہے کہ آپ کے تعلیمی نصب العین کے عملی نفاذ میں غالباً آپ کی وفات کا واقعہ زیادہ اثر انداز ہوا۔ ہر شخص کے بس کی بات یہ نہ تھی کہ جس زمانے میں مدرسہ قائم ہوا تھا ' اور جو ماحول اس عہد کا تھا ' اس میں اس تعلیمی

نصب العین اور اس کے ثمرات و فوائد کا صحیح اندازہ لگا سکتا۔ روداد میں درج ہونے کے باوجود آپ کے اس تعلیمی نصب العین کا چرچا لوگوں میں بعد کو نہیں کیا گیا' حتیٰ کہ اس کا خیال بھی لوگوں میں باقی نہ رہا۔ سوچنے والے کی بات شاید سوچنے والے کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔

گو واضح اور صریح شہادت تو میرے پاس نہیں ہے' لیکن جو تبدیلیاں آئے دن اس شش سالہ نصاب میں ہوتی رہیں' ان کو دیکھ کر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس نصاب کو درس نظامیہ والے مولویوں نے اس لیے قبول نہیں کیا کہ ایک کے سوا فلسفے کی کوئی کتاب اس نصاب میں نہیں رکھی گئی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم کے نصاب میں درس نظامیہ کی ایک ایک معقولی کتاب اپنے تمام حواشی کے ساتھ بہ تدریج شریک ہوتی چلی گئی' جن کو خارج کر کے نصاب کو محدود مدت میں ختم کرانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ فارسی ادب کی کتابوں کا اضافہ کر کے' ملک کے قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کی تسکین کا کام لیا گیا۔ ادب عربی کی نظم و نثر کو داخل کر کے جدید تعلیم یافتوں کے اس مطالبے کی تکمیل کی گئی تھی کہ عربی پڑھنے والے مولوی بھی عربی میں بول کر اور لکھ کر ہم کو دکھائیں۔ بہرحال اسی سہ عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کا تعلیمی نصاب کافی بوجھل اور عریض و طویل ہوتا چلا گیا۔ اسی نصاب کے ختم کرنے میں پڑھنے والوں کی عمر کا کافی حصہ صرف ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ لمبی لمبی داڑھیوں کے ساتھ سرکاری مدارس میں داخل ہو کر پڑھنے کی صورت ہی کیا تھی؟ اور یوں حضرت کا تعلیمی نصب العین صرف ایک تاریخی نصب العین بن کر رہ گیا۔ آخر اگر یہ نہ مانا جائے' تو پھر اس واقعہ کی کیا توجیہ کی جائے کہ یہ سب تبدیلیاں ہوتی رہیں' اور کسی طرف سے کوئی مخالفانہ آواز مجلس شوریٰ میں نہیں اٹھائی گئی۔

بہت زیادہ طول کلامی سے مجھے کام لینا پڑا' لیکن کرتا کیا؟ حضرت کا صحیح تعلیمی نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جب یہی چاہا گیا تھا کہ دینی تعلیم کے بعد جدید علوم اور نئی علمی زبانوں سے استفادہ کا موقع مسلمان بچوں کے لیے فراہم کیا جائے' تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ اور تقریباً ایک صدی کی طویل تاریخ میں کوئی ایک "دو نمونہ" بھی اس تعلیمی نصب العین کے مطابق دیوبند کا دارالعلوم کیوں پیش نہ کر سکا؟ قدیم و جدید علوم و السنہ کے پیوند کی جو مہم آپ سر کرنا چاہتے تھے' افسوس ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم اس وقت تک اس کے سر کرنے میں ناکام رہا ہے۔

ہمارے درس نظامیہ کے تدریسی حلقوں میں فلسفے کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا' وہ اس زمانے میں قطعی طور پر مردہ ہو چکا تھا۔ لیکن ہمارے علما محض موروثی روایات کے زیر اثر اسی مرحوم و مدفون فلسفے کی کتابیں پڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ آپ ہی بتایئے کہ طلبہ کا قیمتی وقت اور عمر کا گراں مایہ حصہ ایک ایسے مہمل مشغلے میں جو برباد ہو رہا تھا' اس پر سنجیدہ دماغوں کو جتنا بھی غصہ آئے کم تھا۔ فلسفے کی

ضرورت مغرب کا جدید فلسفہ ہی پوری کر سکتا تھا' لیکن اس کی طرف نظامی درس کے معقولی علما نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت قدیم علوم کا جدید علوم سے جو رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے' یہ رشتہ اگر قائم ہو جاتا' تو بجائے اس مردہ فلسفے کے یورپ کے جدید فلسفے کے مطالعے کا موقع ہمارے علما کے لیے باآسانی میسر آسکتا تھا۔

۲۔ سید مناظر احسن گیلانی: مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ج ۲

سالہا سال کے غور و فکر اور مختلف تعلیمی نظاموں کے تجربے کے بعد نصاب تعلیم اور مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات کے مسئلے میں جس نتیجے تک پہنچا ہوں' وہ میری کتاب نظام تعلیم و تربیت میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

آج تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک کا نام دینی علوم' اور دوسرے کا نام دنیاوی علوم رکھا گیا ہے۔ دونوں کی تعلیم گاہیں الگ الگ ہیں' دونوں کا نصاب تعلیم جدا جدا۔ ایک طرف یونی ورسٹیاں اور کالج' اور ان کے "تعلیم یافتہ" حضرات ہیں' اور دوسری طرف دینی مدارس اور ان کے "علما اور مولوی" ہیں۔ علم کا دعویٰ دونوں کو ہے' دونوں مسلمانوں کی راہ نمائی کے دعوے دار بھی ہیں۔ عوام ان کے ہاتھوں میں فٹ بال کی گیند بنے ہوئے ہیں۔ مولوی جب ان کے پاس آتے ہیں تو تعلیم یافتوں کی مغرب زدگیوں' دینی بے باکیوں' غلامانہ ذہنیتوں کا ماتم کرتے ہیں' ان کی منڈی ہوئی داڑھیوں' بود و باش کے یورپین طریقوں کو شہادت میں پیش کر کے محمد رسول اللہ ؐ کی امت کے دلوں میں ان کی نفرت کا بیج بوتے ہیں' ان کا مذاق اڑاتے ہیں' بھری مجلسوں میں انھیں منبر و محراب سے رُسوا کرتے ہیں۔ اور یہی حال تعلیم یافتوں کا ہے۔ وہ مولویوں کی قدامت پرستیوں' تنگ نظریوں' غربت کی وجہ سے ان کی پست زندگی کے نمونوں پر فقرے کستے ہیں' ان پر چھچھوری حرکتوں کا الزام لگاتے ہیں' معمولی معمولی جزئی غیر منصوص مسائل پر طیش دلا دلا کر مسلمانوں کو لڑانے کا انھیں مجرم ٹھہراتے ہیں۔

غرض مسٹر اور مولوی' ان دونوں کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش جاری ہے' بلکہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ انھی خانہ جنگیوں میں دین بھی برباد ہو رہا ہے' دنیا بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا اگر برباد بھی ہو جائے تو اس سے تسلی مل سکتی تھی کہ دین تو باقی ہے۔ لیکن آج تعلیم کے ان دو مختلف الجہت نظاموں کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے اندر العیاذ باللہ دین کی نفرت پرورش پا رہی ہے۔ دین کے عالموں کی رسوائی کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو کہیں خود دین کی رسوائی پر اس ناپاک تحریک کا خاتمہ نہ ہو۔ خاکم بدہن خدانخواستہ اگر ایسا ہوا' اور جو حالات ہیں ان کے دیکھتے ہوئے کیا کہا جا سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے' تو اس کا الزام کیا صرف کسی ایک ہی طبقے پر ہو گا؟

کیا عوام کو تعلیم یافتوں اور ملاؤں کے قدموں کی ٹھوکر میں اس طرح ڈالے رکھنا کسی اچھے انجام کی ضمانت ہے؟ مصیبت کا احساس سب کو ہے 'لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ کیا سکولوں اور کالجوں میں نام نہاد دینیات کے کورس کے اضافے سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائے گا؟ یا پھر عربی تعلیم گاہوں میں انگریزی کی چند ریڈریں' یا روشن خیال مولویوں کے نزدیک جس چیز کا نام سائنس ہے اس مولویانہ سائنس کی تعلیم اس مرض کا علاج ہے؟ ایسی جھوٹی امیدوں میں تسلی ڈھونڈنا' کیا ایمانی عقل اس پر راضی ہو سکتی ہے؟ مرض کے اسباب کی غلط تشخیص اور اسی غلط تشخیص کی بنیاد پر مریض کا جو غلط علاج ہو رہا ہے' اہل بصیرت اس تماشے کو تقریباً پون صدی سے دیکھ رہے ہیں' اور دل ہی دل میں پڑھ رہے ہیں۔

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے

میرے نزدیک تو ان ساری تباہ کاریوں اور بربادیوں کے انسداد کی واحد تدبیر' کوئی نئی تدبیر نہیں بلکہ نظام تعلیم کی وحدت کا قدیم اصول ہی ہو سکتا ہے۔ افسوس کہ ہم لوگوں نے اپنے بزرگوں کی قیمت نہیں پہچانی جنھوں نے تیرہ سو سال کی طویل مدت میں علم کی اس دو عملی اور تقسیم کو شدت کے ساتھ روکے رکھا۔ لوگ سوچتے نہیں ہیں' ورنہ میں مسلمانوں کے چند اہم کارناموں میں سے ان کا ایک بڑا کارنامہ تعلیمی نصاب کی اسی وحدت کو سمجھتا ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان میں وہی تعلیم یافتہ بھی تھے جو علما کہلاتے تھے' اور وہی علما تھے جنھیں آج تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے۔

درس نظامیہ کے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ یعنی' چند مختصر فقہی متون کے سوا' قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے)' حدیث کے متعلق مشکوٰۃ' اور فقہ کے سلسلے میں شرح وقایہ اور ہدایہ جو حکماً و عملاً ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی۔ ان کے سوا طلبہ جو کچھ پڑھتے تھے' فارسی (یعنی دفتری زبان) کی نظم و نثر کی کتابوں کے علاوہ' منطق' فلسفہ' ہیئت' اقلیدس' ادب عربی' اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنھیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا' یعنی علم کلام' اور علم اصول فقہ' معانی و بیان وغیرہ۔ ان علوم و فنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا کہ صرف منطق و فلسفے کی کتابوں کی تعداد آخر زمانے میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی۔

چنانچہ قدیم نصاب میں قرآن' حدیث' فقہ کو محوری اور اساسی مضمون قرار دے کر' اور درس

کے لیے ہر مضمون کی ایک ایک ٹھوس جامع ، حاوی ، مختصر کتاب کا انتخاب کر کے ، پورے نصاب میں صرف تین کتابوں کو کافی قرار دیا گیا۔ اس کے بعد پڑھنے والوں کے لیے ایک وسیع میدان چھوڑ دیا گیا۔ اس میں جیسی ضرورت تھی ، تقریباً ساٹھ ستر غیر دینیاتی کتابوں کی کافی گنجایش نکل آئی۔ پھر جب تک موقع تھا ان غیر دینیاتی مضامین کی حیثیت اختیاری مضامین کی رہی ، اور جیسے جیسے زمانے کا مطالبہ بڑھتا گیا ان مضامین میں سے جن کو لازم قرار دینے کی حاجت ہوئی ، انھیں لازم قرار دے دیا گیا۔ یوں مسلمانوں کے اس واحد تعلیمی نظام سے فلسفی ملا ، مُہندِس ملا ، ادیب ملا ، الغرض باوجود ملا ہونے کے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہی بن بن کر نکلتے رہے۔

میں بزرگوں کے اسی طرز عمل کو پیش کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصے کو ، جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں ، یا کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے ، ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبولہ علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے ، مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے ، دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ دینی تعلیم کو اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ ، جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے ، اسی طرح ، بی۔اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانے میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی۔ ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہو گا اور ہر گریجویٹ عالم ، ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ملا۔ عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

ملائیت کہیے یا دینی علوم ، ان کے لیے جب صدہا سال تک وہی تین کتابیں کافی سمجھی گئیں ، تو پھر آج بھی اسی ملائیت کے لیے یا ایک دینی عالم ہونے کے لیے یہی تین کتابیں کیوں کافی نہ ہوں گی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسکولوں اور کالجوں میں بی۔اے ہونے کے لیے جو کم از کم چودہ سال کی تعلیم ضروری ہے ، اس چودہ سال کے نصاب میں دینیات کی ان تین کتابوں (قرآن ، مشکوٰۃ ، ہدایہ و وقایہ) کی جگہ نہیں نکل سکتی۔ اور بالفرض ان تین کتابوں کے لیے جگہ نہ نکل سکتی ہو ، تو کیوں نہ ہم اپنے سارے دینی اور دنیوی تعلیمی نظامات کو بجائے دوئی کے وحدت کے رنگ میں ڈھال لیں ، اور اپنا نصاب خود بنائیں۔

سچ یہ ہے کہ بزرگوں کے اس عجیب و غریب نمونے پر جب سے مجھے تنبہ ہوا ہے ، یعنی دینیات

کی کل تین کتابوں کے سوا ملائیت کے نصاب کا سارا میدان غیر دینیاتی کتابوں سے بھرا ہوا ہے ' اسی وقت سے میں اپنے اندر اس یقین کو پاتا ہوں کہ اسی میدان میں ' قدیم مطالبے والے غیر دینی علوم کو نکال کر ' بہ آسانی موجودہ مطالبوں کے مطابق والے مضامین کے لیے پوری پوری جگہ نکال سکتے ہیں۔

میری تجویز پر پہلا شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لیے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے ' اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ محفوظ ہیں۔اردو بولنے والی قوموں کے لیے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت رکھتا ہے ' یعنی اسی پچاسی فیصد الفاظ اس حصے کے انھیں باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں۔چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خود بخود سمجھنے لگتا ہے۔البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت و عہد اسلامی کے خالص ادبی نثر و نظم کی کتابیں ہیں یقیناً دشوار ہے۔لیکن اس عربی کے سیکھنے کی ضرورت ہر اس شخص کو نہیں ہے جو صرف اسلامی امور کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ قابلیت کوئی حاصل کر سکتا ہے۔ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے ' اور اختصاص بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے۔میری گفتگو صرف عام و لزومی واقفیت تک محدود ہے۔درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علما کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا ' ان تین کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد اب بھی ان سے امید کی جاتی ہے کہ اس معیار تک پہنچا جاسکتا ہے۔باقی رہا اختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا ' اس کے لیے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی ' بالکل جس طرح غیر دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے۔

تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر و نظر نے اب تک جو کچھ سوچا ' سمجھا ' لکھا ' پڑھا تھا ' دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو ' کیا ان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا مناسب ہو گا؟ علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گو نہ تعلق بھی ہے ' خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح توضیح کے لیے ایجاد کیا تھا۔ان علوم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ مناسب ہو گا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھ دیا جائے ' کچھ لوگوں کا پڑھنا ' پڑھانا ' ان کی بقا اور ارتقا کے لیے کافی ہو گا۔

آخری بات عرض کروں۔تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونی ورسٹیوں میں

مقرر ہے' تو تعلیم کے اس سلسلے کو اس طرح چلانا چاہیے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کر لیں' انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوٰۃ یا اسی قسم کا کوئی مجموعہ حدیث پڑھا دیا جائے' اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنی معلومات حاصل کر لینا چاہیے جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قرآن کو تو بہرحال قرآن ہی کے ذریعے سے پڑھانا چاہیے' لیکن مشکوٰۃ و ہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے۔ مقصود معیار کا تعین کرنا ہے' یعنی ان کتابوں کے پڑھ لینے کے بعد حدیث و فقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اس کو کسی ذریعے سے حاصل کرنا چاہیے۔

۳۔ دینی مدارس کا تعلیمی نظام: سیمی نار' زیر اہتمام انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' ۲۳-۲۴ نومبر' ۱۹۸۶: تعلیم اسلامی تناظر میں' شمارہ ۵

مولانا سید محمد متین ہاشمی: سرسید احمد خان کی تحریک دنیاوی طور پر اصلاحی تحریک تھی' اور نیک نیتی پر مبنی تھی۔ علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند کے نظریات میں جوہری اختلاف نہیں پایا جاتا۔ جو اختلاف نظر آتا ہے اسے طریق کار کے اختلاف کا نام دیا جا سکتا ہے۔ سرسید احمد خان نے یہ محسوس کیا کہ کہیں جدید تعلیم میں سبقت حاصل کر کے ہندو انگریز کے زیر سایہ مسلمانوں پر تسلط نہ حاصل کر لے' اس لیے انھوں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ کیا۔ علماے دیوبند نے یہ دیکھ کر کہ برطانوی سامراج نے جن جن اسلامی ممالک پر اپنا تسلط قائم کیا ہے وہاں کے مسلمانوں کی دینی اقدار کو پامال کیا اور پوری کوشش کے ساتھ ان کے دل و دماغ کو عیسائی بنایا' یہ ضروری سمجھا کہ خیرات کی روٹیاں کھا کر اور چٹائیوں پر بیٹھ کر دینی علوم اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کی جائے' اور کمال دیانت داری سے اسلاف کے اس ورثے کو آنے والی نسل تک منتقل کر دیا جائے۔

ایسے مواقع پر ہر جماعت متشدد ہو جاتی ہے' اور اس کا تشدد اور تصلّب ہی اس کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ کیونکہ جب باہر سے حملہ ہو رہا ہو تو قلعے کے ہر سوراخ کو بند کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر دونوں جماعتوں کے اس طرز عمل نے ایک ناقابلِ عبور خلیج مسلمانوں کے دونوں طبقات کے درمیان پیدا کر دی۔ ایک جماعت نے مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو آمنّا وصدّقنا کہا' اور دوسری جماعت نے اسے کفر و الحاد گردانا۔ قیام پاکستان کے بعد چونکہ اقتدار جدت پسند طبقے کے ہاتھ میں آیا' اس لیے انھوں نے مغربی افکار اور مغربی علوم کے لیے پاکستان کے دروازے چوپٹ کھول دیے' اور بقول جوش یہ حال ہے۔

چال انگریزی' ڈھال انگریزی' جسم کا بال بال انگریزی
جسم ہندی میں جان انگریزی' اور منہ میں زبان انگریزی

میرے خیال میں مسئلے کا حل یہ ہے کہ نظام تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ اسلاف کی روایات کا تحفظ بھی ہو اور عصری تقاضوں کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسلامیات کو کالجوں میں داخل کر دینے سے ' اور انگریزی اور سائنس کو درس نظامی میں سمو دینے سے ہمارا موجودہ مسئلہ حل ہو جائے گا تو غلط ہے۔ اس اقدام سے شترگربگی پیدا ہوگی ' جو دونوں میں سے کسی طبقے کے لیے مفید نہیں ہوگی۔

دینی مدارس سے فارغ ہونے والے افراد کے لیے امام مسجد اور خطیب ہونا ہی کافی نہیں ' بلکہ انھیں تمام شعبہ ہائے حیات میں موثر کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے مدارس کے نظام میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ میرے خیال میں صحیح معنوں میں خطیب بھی نہیں ہوتے ' صرف چند روایات اور اختلافی مسائل کے حافظ ہوتے ہیں اور امت میں افتراق و انتشار پیدا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کا جو صحیح علم ہونا چاہیے ' باوجود آٹھ دس سال لگانے کے ان کی دسترس میں وہ نہیں آتا۔ اس لیے کہ ان کے آٹھ سالہ دور تعلیم میں ان کے چھ سال صرف علوم آلیہ کی تحصیل پر صرف ہوتے ہیں۔ ساتویں سال میں وہ "موقوف علیہ" پڑھتے ہیں ' اور آٹھویں سال میں "دورہ حدیث"۔ موقوف علیہ میں وہ صرف جلالین شریف پڑھتے ہیں ' جسے تفسیر سے زیادہ ترجمہ کہنا چاہیے۔ بعض مدارس میں تبرکاً بیضاوی ' جو صرف سورہ بقرہ تک پڑھائی جاتی ہے ' متداول ہے۔ حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوٰۃ پڑھائی جاتی ہے ' اور اس کے پڑھانے کا طرز یہ ہے کہ اختلافی مسائل مثلاً آمین بالجہر ' رفع یدین اور قرات خلف الامام پر طویل بحثیں ہوتی ہیں۔ ان بحثوں کا نتیجہ یہ ہے کہ علم حدیث جو حقیقی معنوں میں علم الاخلاق ' علم الاقتصاد و عمرانیات ' علم المعاملات اور علم الاعتقاد کا جامع ہے ' محض چند فروعی مسائل کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے طلبہ میں کج بحثی اور فرقہ واریت پیدا ہوتی ہے۔ دورہ حدیث کا مطلب میرے خیال میں "دوڑو" ہے ' یعنی چند اختلافی مباحث کے سوا شاگرد خاموش بیٹھا رہتا ہے اور استاد متن حدیث کی تلاوت کرتا جاتا ہے۔

اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اس لیے نصاب کو بھی تبدیل ہونا چاہیے۔ نصاب کو تبدیل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس تعلیم کے اغراض و مقاصد کا تعین کر لیا جائے جو میرے خیال میں حسب ذیل ہیں: (الف) قرآن و سنت میں بصیرت تامہ کا حصول ' (ب) اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں تعمیر سیرت و کردار ' (ج) تبلیغ و اقامت دین ' (د) نظریہ پاکستان سے مکمل وابستگی ' (ہ) تزکیہ نفس ' (و) عصری علوم سے حسب ضرورت واقفیت۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے ابتدائی دو سالوں میں علوم آلیہ ' مثلاً صرف و نحو ' ابتدائی عربی

ادب بلاغت 'ابتدائی منطق و فلسفہ قدیم کی تکمیل کرائی جائے 'یہاں تک کہ متعلم عربی عبارت پڑھنے اور ترجمہ کر لینے پر قادر ہو جائے ۔بعد کے چار سالوں میں عقائد و کلام 'فلسفہ جدید کے مبادیات 'منطق جدید' ترجمہ قرآن مکمل ' فقہ مکمل 'تاریخ عالم و تاریخ اسلام' جغرافیہ' مبادیات سائنس 'انگریزی' اصول فقہ 'اصول حدیث 'اصول تفسیر 'فلسفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پڑھا دیا جائے ۔بقیہ دو سالوں میں تفسیر کی ایک اہم کتاب (میرے خیال میں تفسیر قرطبی) پڑھائی جائے 'اور کوئی ایک جدید تفسیر (مثلاً تفسیر سید قطب یا کوئی بھی تفسیر بطور مطالعہ) داخل درس رہے ۔ دورۂ حدیث کو دو سالوں میں تقسیم کیا جائے ۔سال اول میں موطا امام مالک ،شرح معانی الآثار ، ابو د او د ، سنن نسائی اور سال دوم میں صحیحین ، ابن ماجه ،نخبة الفكر ،موطا امام محمد ،ترمذی پڑھائی جائے ۔

۲۔ مفتی سیاح الدین کاکاخیل : مولانا نظام الدین کے بعد پیدا ہونے والے مصنفین کی کتابیں بھی درس نظامی میں شامل ہیں 'اور مسلسل شامل ہوتی رہی ہیں ۔اس لیے اگر حالات کے اعتبار سے بعض کتابیں اب خارج کی جائیں اور بعض اور مفید کتابیں شامل کی جائیں 'تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا ۔یہ نہ اسلاف کے طریقے سے روگردانی ہوگی 'اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ فوائد فوت ہو جائیں گے جو درس نظامی کے پڑھنے سے حاصل ہوتے رہے ہیں ۔

مگر آج کل درس نظامی کا نام لے کر اس پر جو تنقید کی جاتی ہے یہ بالکل بے جا ہے 'اور کچھ فیشن سا بن گیا ہے کہ ہر کوئی اٹھتا ہے اور اس انداز سے گفتگو کرتا ہے کہ گویا اس نصاب تعلیم نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا 'اور اس کی جگہ کوئی نیا نصاب مرتب کر کے دینی مدارس میں رائج کیا جانا چاہیے ۔حالانکہ درس نظامی ماضی کے ہر دور میں نہایت ہی کامیاب ثابت ہوا ہے ۔ بڑے بڑے جید علما 'جو تمام علوم پر اچھی طرح حاوی ہوتے تھے اور انھوں نے بہت سے علمی اور عملی کارنامے سرانجام دیئے ہیں 'اسی درس نظامی سے پیدا ہوئے ۔

اس لیے میری رائے میں سابقہ علمی خدمات پر پانی پھیرنے اور مخالف تبصرے کرنے کے بجائے یہ سوچا جائے کہ صحیح معنوں میں عالم بننے کے لیے موجودہ حالات میں اس درس نظامی کی کن کتابوں کو باقی رکھا جائے 'اور کن کتابوں کو بدل کر ان کے بجائے دوسری ایسی کتابیں رکھی جائیں جن کے پڑھنے سے اصل مقصد حاصل ہو سکے ۔فلسفہ قدیمہ کی کوئی ایک دو کتابیں تو نصاب میں ضرور رکھی جائیں ' کیونکہ ہمارے تمام دینی لٹریچر میں وہی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں ۔البتہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ان کے پڑھنے پڑھانے پر اتنا وقت صرف کریں جتنا پہلے صرف کیا کرتے تھے ۔ان کتابوں کے بجائے جو جدید نظریات ہیں 'اور جن نظریات کی بنیاد پر پوری مغربی تہذیب اور بڑے بڑے ملکوں کے نظام چل

رہے ہیں' ان کو پڑھایا جائے۔ ان کے بارے میں ایسی کتابیں اردو میں مرتب کی جائیں کہ پڑھنے والے طلبہ کو صرف سرسری اور سنی سنائی باتیں نہیں بلکہ مستند حوالوں کی روشنی میں ہر فلسفے کی اصل حیثیت اور بنیادی اصولوں کا علم ہو۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ ان میں سے ہر فلسفے کی خامیاں' کمزوریاں اور خلاف حقیقت ہونا بھی اچھی طرح سمجھایا اور پڑھایا جائے۔

اسی طرح دینی مدارس میں کم سے کم درجہ وار اجمالی تاریخ پڑھانا' تاکہ اس مضمون کے ساتھ طلبہ کو انس پیدا ہو اور پھر وہ خود مطالعہ کر سکیں' کسی حد تک نصاب میں رکھنا بھی وقت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح علامہ خضری کی کتاب التشریع الاسلامی بھی فقہ کی کسی کتاب کے ساتھ پڑھائی جائے تاکہ تدوین فقہ کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہو۔ موجودہ دور میں علم معیشت نے بھی خاص اہمیت حاصل کی ہے۔ اس لیے اسلام کا معاشی نظام بھی باقاعدہ دلائل کے ساتھ پڑھایا اور سمجھایا جائے۔

میری رائے میں نصابی کتابوں کی تبدیلی سے بڑھ کر اہم چیز طریقہ تعلیم و تدریس ہے۔ اب تک تفسیر و حدیث اور فقہ پڑھاتے وقت جن مسائل پر اساتذہ اور طلبہ دونوں اپنا سارا زور صرف کرتے تھے وہ زمانہ ماضی سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے اس دور میں جدید معتزلہ نے' جو عقلیت پسندی کے زعم باطل میں مبتلا ہیں' نئے نئے مسائل کھڑے کیے ہیں اور نئے نئے شبہات پیدا کر رہے ہیں۔ اب دین کی خدمت یہ ہے کہ تعلیم و تدریس میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طلبہ مدارس سے نکل کر ہر میدان میں تقریر و تحریر کے ذریعے اس نئے دور کے معتزلہ کا مقابلہ کر سکیں۔ ہدایہ، ترمذی اور بخاری پڑھاتے ہوئے' اجتماعی مسائل احادیث کی روشنی میں حل کیا کریں' تاکہ اساتذہ اور طلبہ موجودہ دور کے تمام پیچیدہ مسائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی روشنی میں بہترین طریقے سے حل کر سکیں۔

اب رہ گئی یہ بات کہ دینی مدارس میں انگریزی پڑھائی جائے۔ اگرچہ میں انگریزی زبان کی افادیت اور ضرورت کا قائل ہوں' لیکن دینی مدارس میں طلبہ کو نصاب کی ان دینی اور فنی کتابوں کے ساتھ انگریزی پڑھانا نقصان دہ سمجھتا ہوں۔ تجربہ یہ ہے کہ اس صورت میں طلبہ کی زیادہ توجہ انگریزی کی طرف ہو جاتی ہے' اور دوسری کتابوں کی طرف توجہ باقی نہیں رہتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل دینی علوم میں بالکل کچے رہ جاتے ہیں۔ ہاں یہ کرنا چاہیے کہ ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا جائے اور جب طلبہ فارغ ہو جائیں پھر خالص انگریزی کی طرف متوجہ ہوں' اور ان شاء اللہ ان دینی علوم کی برکت سے ذہن اتنا قوی اور صاف ہوا ہو گا کہ تھوڑے عرصے میں اچھی انگریزی سیکھ سکیں گے۔

۴۔ کل ہند اجتماع مدارس اسلامیہ عربیہ: ۲۶- ۲۸ نومبر ۱۹۹۴' دیوبند' ماہنامہ دار العلوم' دیوبند' نومبر' دسمبر ۱۹۹۴

۱۔ مولانا مرغوب الرحمان مہتمم ' دارالعلوم دیوبند: مسلمانوں کی اقبال مندی کا دور بھی دینی اور دنیوی علوم کی تفریق سے خالی نہیں رہا ہے۔ قرآن و سنت کی نصوص میں بھی اس تفریق کے واضح اشارے موجود ہیں۔ رسول پاک ؐ نے انتم اعلم بامور دنیاکم اور من یرد اللّٰہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین فرما کر علم کو دو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ الدنیا مطی الآخرۃ کا ارشاد بھی اس تقسیم کی طرف مشیر ہے ' اس لیے کہ سوار اور سواری کے فرق کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مادیت کے فروغ اور مغربیت کے عروج سے آج ہمارا پورا معاشرہ زوال کی زد میں ہے ' اس لیے اصلاح و تربیت کی اہمیت و ضرورت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ طلبہ کے مزاج و مذاق تیزی کے ساتھ تغیرپذیر ہیں ' اس لیے یہ مسئلہ نہایت دل سوزی و بالغ نظری کے ساتھ غوروفکر کا طالب ہے--- اس مشینی دور میں عام طور پر طبیعتیں محنت و مشقت کی بجائے سہولت پسند ہوگئی ہیں ' جس سے مدارس کے طلبہ مستثنیٰ نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں نہ اب پہلے جیسے دل و دماغ ہیں ' نہ پرسکون ماحول۔ اس لیے فن کی بعض وہ کتابیں جو ذہنی ریاضت چاہتی ہیں ان کی متبادل آسان کتب تلاش کی جائیں۔ فن تاریخ و سیرت ' جو خالص اسلامی فن ہے ' ہمارا نصاب اس سے خالی تھا ' کسی طرح اسے نصاب میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ مولانا سعید احمد پالن پوری ' استاذ حدیث ' دارالعلوم دیوبند: کیفیت میں بڑی کمی آرہی ہے۔ ان مدارس سے رجال کار کی تیاری کا جو کام ہو رہا تھا اس میں بہت کمی آگئی ہے ' اور زمانہ ماضی میں جیسے افراد تیار کیے جاتے تھے اب اس معیار کے افراد تیار نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ پہلو انتہائی تکلیف دہ ہے۔ جہاں تک کمیت کا تعلق ہے ' طلبہ کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے--- لوگ علوم عصریہ کو دینی مدارس میں ' جس انداز میں داخل کرانا چاہتے ہیں ' وہ بہت نقصان دہ ہے۔ ہم علوم عصریہ کے مخالف نہیں ہیں ' بلکہ فی زمانہ ان کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں۔ مگر ان کو اصلی کا درجہ نہیں دیتے۔ خود دارالعلوم کے شعبہ دینیات و فارسی میں ہندی ' انگریزی ' حساب اور جغرافیہ وغیرہ موجود ہے۔

۳۔ مولانا سید اسعد مدنی : [بنیادی طور پر نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا] آج ہم لوگ جس دور سے گزر رہے ہیں وہ بڑا خطرناک ہے ' عیسائی اور یہودی طاقتیں اپنے بھرپور وسائل کے ساتھ اسلام کو مٹانے پر تلی ہوئی ہیں ' مسلمانوں کے خلاف ان کی عیارانہ سازشیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں ' ان کا نشانہ خاص طور سے دینی مدارس ہیں۔ مدارس عربیہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلیوں کی بات بھی ایسی ہی سازشوں کا ایک خطرناک حصہ ہے۔

۴۔ مولانا ریاست علی : اکابر نے اسلام کی بقا کی خاطر ایک نصاب تعلیم مرتب کیا۔ حضرت نانوتوی کی مختلف تقریروں میں یہ کہا گیا ہے کہ اس نصاب میں وہ فنون شامل نہیں کیے گئے ہیں جو عصری

تقاضوں سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ عصری علوم کے ہزارہا ادارے ہیں۔اس لیے امت میں جس علم و فن کی کمی تھی ،یعنی دینی علوم ،اس کی رعایت کرتے ہوئے اس کے نصاب کو خالص دینی بنیادوں پر قائم کیا گیا۔بعض حضرات سائنس اور علوم جدیدہ کو نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیتے ہیں۔ہمیں بھی ان کی افادیت سے انکار نہیں ،لیکن اس اضافے کو ہم دینی مدارس کے مذاق و مزاج کے حق میں نقصان دہ باور کرتے ہیں۔اس سلسلے میں میڈیا کا مسلسل مطالبہ بظاہر ایک سازش ہے۔اس طرح وہ انسان کو مذہب سے غافل اور دین سے دور کرنا چاہتے ہیں۔

۵۔ مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی: میرے نزدیک نصاب تعلیم میں تبدیلی نہ پہلے کوئی گناہ تھی ،نہ آج ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔زمانہ بدل رہا ہے ،حالات بدل رہے ہیں ،قدریں بدل رہی ہیں ، ان حالات میں ہمیں کس طرح چلنا ہے سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے۔اگر آپ حضرات نے صحیح فکر سے کام نہیں لیا اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے طرز پر اپنے اداروں کو ڈھالنے کی کوشش کی ،تو کل آپ کو قرآن و حدیث کے معنی و مفہوم کو بھی بدلنا پڑے گا۔اس وقت تو آپ یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم قرآن و حدیث کو تبدیل کرنا نہیں چاہتے ،لیکن اس کا انجام وہی ہوگا۔ہمیں اور آپ کو ہرحال میں اکابر کی رَوِش پر ہی قائم رہنا چاہیے ،اسی میں عافیت مضمر ہے۔میں جدید تعلیم کا ہرگز مخالف نہیں ہوں ، بلکہ میری تو دلی تمنا ہے کہ مسلمان ڈاکٹر بنیں ، انجینیر بنیں ،سائنس دان بنیں۔لیکن اس کے لیے میں مناسب نہیں سمجھتا کہ دینی مدارس کے طلبہ کو ڈسٹرب کیا جائے۔آج تو ہمارے تقریباً اٹھانوے فیصد بچے مدارس دینیہ کے بجائے اسکول و کالج اور یونی ورسٹیوں ہی کا رخ کر رہے ہیں ،اور اپنے اپنے حوصلے کے مطابق جو بننا چاہتے ہیں ،بن رہے ہیں۔للہ ، ان دو فی صد بچوں کو آپ خالص علوم دینیہ ہی حاصل کرنے دیں۔

۶۔ مولانا شاہ ابرار الحق: ہمارے مدارس کی علمی زندگی میں انحطاط کیوں آرہا ہے؟ میں اس سلسلے میں چند باتیں پیش کر رہا ہوں۔جب اساتذہ کا تقرر کیا جائے تو بقدر ضرورت تقویٰ اور ان کی بھرپور صلاحیتوں کا جائزہ بھی لیا جائے۔اساتذہ کے لیے ایک تربیت گاہ کی بھی شدید ضرورت ہے۔ ماہانہ امتحان کا التزام بھی ہونا چاہیے۔اچھے نمبروں پر طلبہ کو انعام سے بھی نوازا جائے۔اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوگی۔قرآن کریم کی تعلیم پر خصوصی توجہ مبذول رہنی چاہیے۔میں نے بعض مدارس میں معاملہ الٹا دیکھا ہے کہ فارسی اور عربی میں تو طلبہ کی استعداد اچھی ہے لیکن قرآن کریم کی تعلیم پر پوری توجہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں بڑی خامی نظر آئی ،جس سے بہت افسوس ہوا۔جو اصل ہے اس میں کمزوری اور جو وسائل ہیں ان میں پختگی!

ذمہ داران مدارس کو طلبہ کے آرام کا خیال رکھنا ضروری ہے ' ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کی فوراً کوشش کی جائے ۔ اس میں بعض جگہ بڑی کوتاہی ہوتی ہے جو نہیں ہونی چاہیے ۔ آپ چندہ کی وصول یابی کے لیے تو اشتہارات میں ان کو مہمانانِ رسول لکھتے ہیں ' مگر ان کے ساتھ معاملہ دوسرا کیا جاتا ہے ' یہ بات بڑی غلط ہے ۔ ان پر شفقت کی نظر رکھی جائے ۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر تعلیم کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں ' ان کی قدر کی جائے ۔ وہ آپ کے محسن معاش بھی ہیں ۔ اگر تمام طلبہ چلے جائیں اور مدرسہ خالی ہو جائے ' تو کون آپ کو چندہ دے گا؟

۵ ۔ مولانا ابو عمار زاہد الراشدی: ماہنامہ الشریعہ ' گوجرانوالہ ' جنوری ۱۹۹۵

دینی مدارس کے مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ یہ سرکار کے اثر سے آزاد رہیں اور ان کے تیار کردہ افراد صرف ان کے مقاصد کے خانے میں فٹ ہو سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس میں انگریزی تعلیم کا داخلہ بند رہا ۔ کیونکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے لازماً سرکاری ملازمت کو ترجیح دیتے اور دینی طلبہ کی ایک بڑی کھیپ اسی طرف منتقل ہو جاتی ۔ اس لیے عماً ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات مسجد و مدرسہ کے سوا کسی دوسری جگہ نہ کھپ سکیں ۔ یہ حکمت عملی کامیاب رہی ' اور اس کے نتیجے میں برصغیر کے طول و عرض میں دینی مدارس و مکاتب کا جال بچھ گیا ' مساجد میں ائمہ و خطبا کی کھیپ بھی فراہم ہوتی رہی ' ساتھ ہی ان مدارس نے معاشرے میں قرآن و حدیث کی تعلیم اور اسلامی عقائد و معاشرت کو برقرار رکھا ۔ گھر گھر سے مانگی ہوئی روٹیوں اور عام لوگوں کے چندوں کی بنیاد پر قائم ہونے والا دینی مدارس کا یہ نظام برطانوی استعمار کی تہذیبی یلغار کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط حصار ثابت ہوا ۔

لیکن دینی مدارس کے موجودہ کردار کے بارے میں عام طور پر شکایات کا اظہار کیا جاتا ہے ' اور شکوہ کرنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں ۔ ان شکایات اور دینی مدارس کی مشکلات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے ۔

سب سے بڑی شکایت یہ کی جاتی ہے کہ ان کے نصاب میں آج کے علوم شامل نہیں ہیں اور وہ اپنے طلبہ کو انگریزی ' ریاضی ' سائنس ' انجینیرنگ اور دیگر عصری علوم کی تعلیم نہیں دیتے ۔ عصری علوم کی مکمل تعلیم تو دینی تعلیم کے نصاب کے ساتھ پوری طرح شامل نہیں کی جا سکتی ' اور نہ ایسا کرنا ضروری ہے ۔ شامل اس لیے نہیں کی جا سکتی کہ عالمِ دین کا مقام حاصل کرنے لیے ضروری علوم کا ایک مکمل نصاب ہے ' اور یہ نصاب اس قدر بھاری بھرکم ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے علم یا فن کے مکمل نصاب کو شامل کرنا ممکن نہیں ہے ۔ اور ضروری اس لیے نہیں ہے کہ کسی ایک شعبے کے ماہر کے

لیے ضروری نہیں کہ وہ دوسرے شعبے کی مہارت بھی رکھتا ہو۔ اس لیے کسی عالم دین کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس ، انجینیرنگ یا کسی شعبے کی مہارت بھی رکھتا ہو۔

تاہم بنیادی اور جنرل معلومات ہر شعبے کے بارے میں حاصل ہونی چاہییں ، اور اس کی اہمیت و ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح انگریزی آج کی بین الاقوامی زبان ہے ، اسلام اور عالم اسلام کے خلاف صف آرا عالمی میڈیا کی زبان ہے ، اور پاکستان کی دفتری اور عدالتی زبان ہے۔ اس لیے عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے کماحقہ بہرہ ور ہونا علما کے لیے آج کے دور میں ضروری ہے۔ اس بنا پر ہم دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں کسی بنیادی تبدیلی یا تخفیف کی حمایت تو نہیں کریں گے ، البتہ اس میں انگریزی زبان اور میڈیکل سائنس ، جنرل سائنس ، انجینیرنگ اور دیگر عصری علوم کے بارے میں بنیادی معلومات کی حد تک نصاب کے اضافے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

اس سلسلے میں دینی مدارس کی مشکلات کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مساجد و مدارس میں مشاہروں اور دیگر سہولتوں کا مُروّجہ معیار کسی طرح بھی اس درجے کا نہیں ہے کہ کوئی خطیب ، امام یا مدرس اطمینان کے ساتھ ایک عام آدمی جیسی زندگی بسر کر سکے۔ پھر یہاں ملازمت کا تحفظ بھی نہیں ہے۔ اس لیے جو طلبہ انگریزی یا دیگر عصری علوم سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور سرکاری اسناد حاصل کر لیتے ہیں ، ان کی اکثریت مساجد یا دینی مدارس کے بجائے ملازمت کے لیے سرکاری اداروں کا رخ کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے ضرورت کے مطابق ائمہ ، خطبا اور مدرس میسر نہیں آتے۔ چنانچہ اگر دینی مدارس اپنے تیار کردہ افراد کو مسجد و مدرسے تک محدود رکھنے کے لیے کچھ تحفظات اختیار کیے ہوئے ہیں تو ان کی اس مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دینی مدارس سے دوسری شکایت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مختلف شعبوں بالخصوص عدلیہ میں مطلوبہ معیار کے رجال کار کی فراہمی کو دینی مدارس کے نظام نے اپنے مقاصد میں شامل نہیں کیا۔ اگر دینی مدارس اپنے نصاب تعلیم کا از سرنو جائزہ لے کر اسلام کو بطور نظام زندگی دوسرے مروجہ نظاموں کے ساتھ تقابل کے ساتھ پڑھانے کا اہتمام کرتے ، اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے حدیث و فقہ کے ابواب کو ضروری اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا ، تو دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علمائے کرام اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے تربیت یافتہ اور شعوری کارکن ثابت ہوتے۔ اور اس کے ساتھ اگر تجارت ، عدالت ، انتظامیہ اور دیگر شعبوں کے افراد کے لیے ہلکے پھلکے کورسز تیار کر کے انھیں دینی مدارس کے تعلیمی دائرہ میں شریک کر لیا جاتا ، تو اسلامی نظام کے لیے رجال کار کی فراہمی کی ایک اچھی بنیاد مل سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے نتائج آج

معاشرے میں فکری انتشار اور اخلاقی انارکی کی صورت میں سب کے سامنے ہیں۔

دینی مدارس سے تیسری شکایت اسلام کے بارے میں مغربی لابیوں اور ورلڈ میڈیا کے منفی پراپیگنڈے کی صورت میں سامنے آنے والے چیلنج کو نظرانداز کرنے کی ہے۔ آج اقوام متحدہ کے چارٹر اور بنیادی حقوق کے مغربی تصورات کے حوالے سے اسلامی احکام اور قوانین کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔ جرائم کی شرعی سزاؤں کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جارہا ہے' ارتداد اور توہین رسالت ؐ پر قدغن کے بارے میں اسلامی قوانین کو آزادی رائے کے بنیادی حق سے متصادم کہا جارہا ہے' اور دنیا میں کسی بھی جگہ اسلامی معاشرے کے قیام کو قرون وسطیٰ کے ظالمانہ دور کی واپسی سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ مگر چند استثناؤں کو چھوڑ کر دینی مدارس میں اس چیلنج کے ادراک کی فضا ہی سرے سے موجود نہیں۔ یہ بلاشبہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

دینی مدارس سے چوتھی شکایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اساتذہ اور طلبہ کو گفتگو اور مباحثے کے نئے اسلوب اور ہتھیاروں سے روشناس نہیں کرایا۔ فتویٰ اور مناظرہ کی زبان قصہ پارینہ بن چکی ہے' مگر دینی مدارس بلکہ ہمارے منبر و محراب پر بھی ابھی تک اسی زبان کا سکہ چلتا ہے۔ اخبارات پڑھنے اور ٹی وی دیکھنے والوں کے لیے ہماری زبان اور اسلوب بیان دونوں اجنبی ہو چکے ہیں' مگر ہم کوئی پروا کیے بغیر اسی ڈگر پر قائم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر دینی مجالس میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب دن بدن کم ہوتا جارہا ہے۔ آج کی زبان منطق و استدلال کی زبان ہے' مشاہدات کی زبان ہے' کسی بھی مسئلے کو اس کے پس منظر اور نتائج کے ساتھ پیش کرنے کی زبان ہے اور انسانی حقوق کے حوالے سے گفتگو کی زبان ہے' مگر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اس زبان سے ناآشنا ہے۔ اور ستم بالائے ستم کہ انگلش اور عربی تو رہی ایک طرف' اردو زبان میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی تحریر کی صورت میں پیش کرنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ ایک پختہ کار عالم دین نے شکایت کی کہ فلاں قومی اخبار کو میں نے درجنوں مضامین بھجوائے ہیں' ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ میں نے اس اخبار کے ایڈیٹر سے بات کی تو انھوں نے جواب دیا کہ جو مضمون ہمیں پورے کا پورا از سرِنو لکھنا پڑے' اسے شائع کرنے کا تکلف ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟

دینی مدارس سے پانچویں شکایت یہ ہے کہ مدارس کی اکثریت ایسی ہے جن میں طلبہ کی فکری' دینی اور اخلاقی تربیت کا نظام موجود نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدارس سے فارغ ہونے والے فضلا کی اکثریت کے ذہنوں میں مشنری جذبے کے طور پر کوئی واضح اور متعین مقصد زندگی نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی کے ذہن میں کوئی مقصد ہو بھی تو اس کے مطابق اس کی تربیت نہیں ہوتی۔

دینی مدارس سے چھٹی شکایت یہ ہے کہ ان کا باہمی ربط و مشاورت کا نظام انتہائی کمزور اور قطعی ناکافی ہے۔اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مدارس کے قیام میں کوئی منصوبہ بندی اور ترجیحات نہیں ہیں۔جہاں جس کا جی چاہتا ہے' ضروریات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر' کسی بھی معیار اور سائز کا دینی ادارہ قائم کر لیتا ہے۔اور چونکہ اوپر چیکنگ کا کوئی نظم موجود نہیں ہے' اس لیے کارکردگی اور اخراجات کا دائرہ شخص واحد یا زیادہ سے زیادہ اس کے منظورِ نظر چند افراد تک محدود رہتا ہے۔ان خود رَو دینی مدارس میں ایک بڑی تعداد ایسے اداروں کی ہے جو تعلیمی اداروں کے بجائے "مذہبی دکانیں" کہلانے کے زیادہ حق دار ہیں' اور ان میں مالی بدعنوانیوں کا سلسلہ دراز ہوتا جارہا ہے۔ سرکاری زکوٰۃ کے حصول کے لیے دنوں میں کئی مدرسے وجود میں آگئے' اور پھر رشوت' سفارشات اور بدعنوانیوں کے جو دروازے کھلے' انھوں نے دینی اداروں کو بھی دیگر سرکاری محکموں کی صف میں لاکھڑا کیا۔وہ مدارس جنھوں نے سرکاری زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے میں کسی دینی اور اخلاقی معیار کی پابندی کا تکلف گوارا نہیں کیا' بدقسمتی سے سرکاری ریکارڈ میں انھی کی فہرست زیادہ لمبی ہے۔

پھر چند معیاری دینی مدارس کو چھوڑ کر' اکثر و بیشتر نے عوامی چندے کے حصول کے لیے جو طریقے کچھ عرصے سے اختیار کر لیے ہیں' انھوں نے چندہ دینے والے اصحابِ خیر کو پریشان کر دیا ہے۔کراچی' فیصل آباد اور گوجرانوالہ جیسے کاروباری شہروں میں رمضان المبارک کے دوران مساجد اور دکانوں پر مدارس کے سفیروں کی جو یلغار ہوتی ہے' اور لوگوں کی توجہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے گفتگو کا جو اسلوب اختیار کیا جاتا ہے' اس سے دینی اداروں کے اعتماد اور وقار کا گراف تیزی کے ساتھ نیچے جا رہا ہے۔اس سلسلے میں سب سے پریشان کن صورت حال پاکستان سے باہر لندن میں دیکھنے میں آتی ہے' جہاں مدارس کے سفرا نماز کے بعد دروازے پر رومال بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں' جہاں نمازی گزرتے ہوئے پاؤنڈ اور سکے پھینکتے جاتے ہیں۔سچی بات یہ ہے کہ میرے جیسے حساس دینی کارکن کی نظریں شرم سے زمین پر گڑ جاتی ہیں۔ابھی چند ماہ قبل" جنگ" لندن میں ایک مسلم نوجوان کا مراسلہ شائع ہوا' جس میں اس نے بتایا کہ برطانیہ میں پلنے بڑھنے والے مسلمان نوجوانوں کی اکثریت مساجد میں اس لیے نہیں آتی کہ ایک تو ائمہ اور خطبا کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی' دوسرے جن موضوعات پر وہ گفتگو کرتے ہیں ان سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے' تیسرے ہر نماز کے بعد کسی نہ کسی مدرسے کا سفیر چندے کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور ان کے پاس ہر آدمی کو دینے کے لیے اتنے پیسے نہیں ہوتے۔

کسی بھی طبقے کی کمزوریاں ہمیشہ اس کے خلاف دشمن کا ہتھیار بنتی ہیں' اور دینی مدارس کے نظام سے نالاں قوتوں نے اس کے خلاف ان کمزوریوں کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔اس لیے ان

مدارس کو اور ان کے وفاقوں کو خود احتسابی کا ایک مضبوط نظام قائم کرنا ہو گا' اور اپنی کمزوریوں کو خود اپنے ہاتھوں دور کرنے کا اہتمام کرنا ہو گا۔ ورنہ یہ کمزوریاں ان کے خلاف صرف مغربی لابیوں کی پروپیگنڈہ مہم کا ہتھیار نہیں ہوں گی 'بلکہ ان مدارس پر ریاستی کنٹرول کی مہم میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔ اس لیے ہم دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ:

○ --- تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے الگ الگ وفاق' اپنا وجود اور نظم قائم رکھتے ہوئے' ایک مشترکہ بورڈ قائم کریں اور مشترکہ معاملات کو اس بورڈ کے ذریعے کنٹرول کیا جائے۔

○ --- درس نظامی کے موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے' اس میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو بنیادی معلومات کی حد تک ضرور شامل کیا جائے۔

○ --- گفتگو اور مباحثے کے جدید اسلوب اور انگریزی اور اردو میں صحافتی زبان سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔

○ --- اسلام کو بطور نظام حیات پڑھایا جائے اور دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرا کے نظام شریعت کی اہمیت و ضرورت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کیا جائے۔

○ --- مدارس کی درجہ بندی کر کے ہر علاقے میں وہاں کی ضروریات کے مطابق مدارس کے قیام کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے۔

○ --- اباحت مطلقہ (فری سوسائٹی) کے مغربی تصور اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفے کے پس منظر اور نتائج سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

○ --- دینی' اخلاقی اور روحانی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور دینی مقاصد کے حصول کے لیے ان میں مشنری جذبہ اجاگر کیا جائے۔

○ --- مالی امداد کے حصول کے لیے باوقار اور آبرومندانہ طریق کار کی پابندی اور غیر معیاری طریقوں کی حوصلہ شکنی کی جائے' اور اس سلسلے میں وفاقوں کی سطح پر ضابطہ اخلاق طے کر کے مدارس سے اس کی پابندی کرائی جائے۔

○ --- اساتذہ کے مشاہروں اور طلبہ کی رہایش' خوراک اور صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جائے' اور کام کو پھیلانے کی بجائے تھوڑے اور معیاری کام کو اصول قرار دیا جائے۔

○ --- مسلم معاشرے میں دینی مدارس کی اہمیت' خدمات اور کردار کے حوالے سے معیاری مضامین کی انگلش اور اردو میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

۶۔ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی: کلیدی خطبہ 'کل ہند دینی مدارس کنونشن' دہلی' زیر

مدارس کو اور ان کے وفاقوں کو خود احتسابی کا ایک مضبوط نظام قائم کرنا ہوگا' اور اپنی کمزوریوں کو خود اپنے ہاتھوں دور کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ کمزوریاں ان کے خلاف صرف مغربی لابیوں کی پروپیگنڈہ مہم کا ہتھیار نہیں ہوں گی 'بلکہ ان مدارس پر ریاستی کنٹرول کی مہم میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔ اس لیے ہم دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ :

○ --- تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے الگ الگ وفاق' اپنا وجود اور نظم قائم رکھتے ہوئے' ایک مشترکہ بورڈ قائم کریں اور مشترکہ معاملات کو اس بورڈ کے ذریعے کنٹرول کیا جائے۔

○ --- درس نظامی کے موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے' اس میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو بنیادی معلومات کی حد تک ضرور شامل کیا جائے۔

○ --- گفتگو اور مباحثے کے جدید اسلوب اور انگریزی اور اردو میں صحافتی زبان سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔

○ --- اسلام کو بطور نظام حیات پڑھایا جائے اور دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرا کے نظام شریعت کی اہمیت و ضرورت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کیا جائے۔

○ --- مدارس کی درجہ بندی کرکے ہر علاقے میں وہاں کی ضروریات کے مطابق مدارس کے قیام کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے۔

○ --- اباحت مطلقہ (فری سوسائٹی) کے مغربی تصور اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفے کے پس منظر اور نتائج سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

○ --- دینی' اخلاقی اور روحانی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور دینی مقاصد کے حصول کے لیے ان میں مشنری جذبہ اجاگر کیا جائے۔

○ --- مالی امداد کے حصول کے لیے باوقار اور آبرومندانہ طریق کار کی پابندی اور غیر معیاری طریقوں کی حوصلہ شکنی کی جائے' اور اس سلسلے میں وفاقوں کی سطح پر ضابطہ اخلاق طے کرکے مدارس سے اس کی پابندی کرائی جائے۔

○ --- اساتذہ کے مشاہروں اور طلبہ کی رہائش' خوراک اور صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جائے' اور کام کو پھیلانے کی بجائے تھوڑے اور معیاری کام کو اصول قرار دیا جائے۔

○ --- مسلم معاشرے میں دینی مدارس کی اہمیت' خدمات اور کردار کے حوالے سے معیاری مضامین کی انگلش اور اردو میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

۶۔ **مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی:** کلیدی خطبہ 'کل ہند دینی مدارس کونشن' دہلی' زیر

اہتمام آل انڈیا ملی کونسل ' ۲۳-۲۵ دسمبر ۹۴: ماہنامہ الفرقان 'نومبر دسمبر ۹۴

۱- بنیادی دینی تعلیم اور بچوں کی ضروری عصری تعلیم: کوئی بھی ملک گیر نقشہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مرتب کرنا چاہیے۔یعنی ایسے خودکفیل مکاتب کا قیام جو مقامی وسائل سے چلائے جائیں ' اور جہاں بچوں کو دین کی ضروری تعلیم کے ساتھ ساتھ موجودہ سیکولر تعلیم سے بھی بہرہ ور کیا جائے ' تا کہ ان کے لیے آیندہ چل کر مدارس عربیہ اور سیکولر تعلیمی اداروں میں سے کسی ایک کی طرف جانے کا راستہ کھلا رہے۔اس احساس کے باوجود کہ مذہبی اور سیکولر تعلیم کے دو متوازی نظام کا تصور ہماری مصیبت کو دوبالا کر دیتا ہے ' اس ثنویت سے مکمل طور پر نجات کا فی الحال ہمارے پاس راستہ نہیں ہے۔ہم ہر سطح تک پورے ملک کے لیے ایسے تعلیمی اداروں کے قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جو دینی اور دنیاوی دونوں ضرورتوں کے لیے کفیل ہو سکیں۔ لہٰذا اس کڑوی حقیقت کے اعتراف کے ساتھ ہمیں اپنا نظام عمل بنانا ہو گا۔

۲- خواتین کی تعلیم: ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ مسلمان ' مرد ہوں یا خواتین ' دونوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔جب تک ہماری خواتین تعلیم یافتہ نہیں ہیں ہمارا گھر سدھر نہیں سکتا ' اور گھر نہیں سدھرتا ہے تو نہ سماج سدھر سکتا ہے اور نہ آنے والی نسلیں صحیح راہ پر چل سکتی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ بنیادی دینی تعلیم سبھی کے لیے فرض عین کا درجہ رکھتی ہے۔کچھ دنوں سے خواتین کی تعلیم کے لیے کچھ کوششیں ہوئی ہیں ' لیکن یہ کوششیں منتشر اور بکھری ہوئی ہیں۔ضرورت ہے بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ ان منتشر کوششوں کو منظم کرنے کی۔

۳- ہمارا ایک بڑا نازک مسئلہ ان بچوں کو دین سے آشنا کرنے کا ہے جو انگلش میڈیم سکولوں ' کرسچین مشن اور شیشومندر کی طرح کے اداروں ' نیز عام سیکولر تعلیمی اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ہمارا متوسط طبقہ اور اعلیٰ طبقہ انھی سکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانا پسند کرتا ہے۔ ہزاروں ہزار روپے ان اداروں کو بطور ڈونیشن دیے جاتے ہیں اور پھر بھی داخلہ مشکل ہوتا ہے۔تعلیم پر خرچہ ' او سطاً ہزار ' پندرہ سو روپے تک پڑتا ہے۔لیکن غربت و افلاس کی شکار یہ قوم یہ بھاری رقم اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے تصور میں شوق سے خرچ کر رہی ہے۔ دوسری طرف ان اداروں میں تعلیم پانے والے بچے دینی تعلیم سے قطعی بیگانہ رہتے ہیں ' حتیٰ کہ وہ قرآن تلاوت کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔ سکولوں کا ماحول غیر اسلامی اور مشرکانہ ہوتا ہے۔اسلامی شعائر اور تہذیب کا پتا بھی بچوں کو نہیں ہوتا ' اور وہ سارے عمل جسے دیکھ کر ایک مسلمان کو چونک جانا چاہیے یہ بچے ان اعمال کو آہستہ آہستہ خوش دلی کے ساتھ قبول کرتے جاتے ہیں۔کچھ ہی لوگ ہیں جو اپنے بچوں کے لیے کسی مولوی

صاحب کو آدھا گھنٹہ یا گھنٹہ بھر کے لیے ٹیچر مقرر کر لیتے ہیں لیکن اس تہذیبی ارتداد کے اثرات کا ازالہ نہیں ہو پاتا۔

۴۔ دینی مدارس : مدارس کے فضلا دراصل تفقہ فی الدین کے اس فرض کفایہ کی ادائگی کے ذمہ دار ہیں جس کا مطالبہ قرآن نے کیا ہے ' اور قرآنی ہدایت کے مطابق انھیں راہ نمائی ' دعوت اور انذار کی نازک ذمہ داریاں انجام دینی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تفقہ فی الدین سے مراد اصطلاحی فقہ اور چند احکام و مسائل کا جان لینا ہی کافی نہیں ہے ' بلکہ اس سے مراد وسیع تر افق میں گہرے مطالعے اور تحقیق و تجسّس کے ذریعے حکمت دین اور حکمت دعوت کی وہ سمجھ ہے جو انھیں دین کو برپا کرنے کی کوششوں کا اہل بنا سکے۔ اس فرض کی ادائگی کے لیے ایسے علما کا وجود ضروری ہے جو کتاب و سنت کو براہ راست سمجھنے کے لیے عربی زبان و ادب کے رموز سے آشنا ہوں ' جن کی نظر مقاصد شرع پر ہو ' جو مدارج احکام میں فرق کر سکتے ہوں ' جو دعوت کے عمومی اپروچ اور مخصوص مخاطبین اور مخصوص حالات میں خصوصی اپروچ کے درمیان امتیاز کر سکتے ہوں ' جن کی نظر حالات زمانہ اور بدلتے ہوئے عرف و عادات ' قوموں و ملتوں کی نفسیات ' ان کے ذہن و فکر کی تشکیل میں ان کی تاریخ کے اثرات ' نئے حالات میں اصول و احکام شرع کی تطبیق اور سلف کی کوششوں کے ذخیرے پر ہو۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے مدارس دینیہ نے ایسے فضلا پیدا کیے ہیں جو کم و بیش ان صلاحیتوں سے مزین ہیں۔ لیکن ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ آج عام طور پر مدارس اسلامیہ کے قیام و تاسیس کے بنیادی اغراض و مقاصد اور ان کا خصوصی تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے ' اور ہم رسمی اور روایتی نظام تعلیم کے اسیر ہو کر اپنی منزل سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

اب تک جو اصلاحی کوششیں ہوئی ہیں ' ان کا اگر جائزہ لیا جائے تو بنیادی طور پر درس نظامی اپنی خصوصیات کے ساتھ بہرحال ہر نئے نصاب تعلیم میں نظر آتا ہے۔ بنیادی موضوعات میں وقتاً فوقتاً غیر محسوس طریقے پر تبدیلیاں ' کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہیں۔ خوش گوار اضافہ عام طور پر مدارس میں ترجمہ قرآن سے متعارف کرانے کی صورت میں ہوا۔ اصول تفسیر میں شاہ صاحب کی الفوز الکبیر آج بھی ہر جگہ داخل نصاب ہے۔ کتاب و سنت اور فقہ اسلامی میں گہری مہارت کی ضرورت سے ' یا ضروری حد تک منطق قدیم اور فلسفہ قدیم کی اصلاحات و مبادی سے واقفیت کی اہمیت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔ مگر عقائد و کلام کے مسائل سے ' جو سابق میں زیر بحث رہے ہیں اور آج بھی نئی صورتوں میں ابھر رہے ہیں ' واقف رہنا بہرحال علما کی ذمہ داری ہے۔

پس مسئلہ مُروج نصاب تعلیم میں کسی جوہری تبدیلی کا نہیں ہے۔ کچھ ان مقصدی علوم میں

اضافے ' مسالک فقہیہ کے تقابلی مطالعے ' کتاب و سنت کی تعلیم وتدریس کے لیے نئے اپروچ اختیار کرنے ' جدید سوالات کو حل کرنے ' اور اسلام کو درپیش مختلف علمی چیلنجز کا سامنا کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی ' اور آج کے افکار و نظریات پر نگاہ اور کتاب و سنت کی روشنی میں ان پر نقد اور رد و قبول کا فیصلہ کرنے کی استعداد کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کچھ ان موضوعات کا اضافہ ضروری ہو سکتا ہے جو اس کائنات کی نت نئی تبدیلیوں ' سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ جدید معاشی نظریات کے ناقدانہ مطالعے اور فقہ اسلامی کے مذکور معاشی اصول کو موجودہ دور کے تناظر میں سمجھنے ' اور موجودہ حالات پر ان کی تطبیق کرنے کے لیے کچھ بنیادی واقفیت بھی ایک عالم کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح دعوت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے اگر بین الاقوامی ملکی یا قومی زبان پر قدرت ضروری ہو تو اس کی تعلیم کے بھی مختلف مدارج قائم کیے جاسکتے ہیں۔

بہرحال ہمیں مدارس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ایسا ادارہ بنانا ہو گا جن سے پیدا ہونے والے فضلا ایک طرف سرچشمہ علوم و نبوت سے مربوط ' اور دوسری طرف اپنے عہد و زمانے سے آشنا اسلام کی صحیح نمایندگی کے اہل ' اخلاق و کردار کے اعتبار سے نمونہ اور اپنے وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے اہل ہوں۔ صورت حال ایسی ہے کہ ہمارے پاس موجودہ مدارس انتشار و افتراق کے شکار ' ہر جگہ تعلیمی معیار کے فقدان اور اخلاق و کردار کی بہتر تربیت سے محروم ہیں۔ کیا اس صورت حال میں مدارس کی اصلاح کے لیے کچھ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور ہاں تو کیا؟ اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

۷۔ فرید احمد پراچہ

ناگزیر ہے کہ درس نظامی کے نصاب پر از سرنو غور کیا جائے ' اور اس میں ترمیم و اضافے اور تنقیص و اصلاح کو عمل میں لایا جائے۔ اس سلسلے میں میری تجاویز حسب ذیل ہیں:

موجودہ نصاب میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں پورا قرآن مجید شامل نصاب نہیں۔ قرآن پاک علوم کا مرکز و محور بلکہ منبع و مصدر ہے۔ اس کا مطالعہ انسان کو علم کی اوج گاہیں بھی عطا کرتا ہے اور کردار کی عظمت بھی۔ چنانچہ ضروری ہے کہ پورا قرآن مجید با ترجمہ و تفسیر شامل نصاب ہو ' اور اسے آٹھ سالوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ نیز خصوصی مباحث الگ پڑھائے جائیں۔ موجودہ شامل نصاب تفاسیر ' جلالین اور بیضاوی ' علوم و فنون کا خزانہ ہونے کے باوجود دور حاضر میں کماحقہ راہ نمائی فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ جبکہ موجودہ زمانے کی کئی عربی تفاسیر زبان و بیان اور مطالب و مفاہیم کے

جملہ تقاضے پورے کر سکتی ہیں۔قدیم تفاسیر میں سے تفسیر قرطبی اور جدید تفسیر میں سے فی ظلال القرآن کو شامل کرنا بھی مفید رہے گا۔

فقہ و اصول فقہ کے نصاب میں کسی اضافہ و کمی کی ضرورت نہیں ' البتہ دورِ جدید کے مسائل مثلاً بلاسود بنکاری ' عائلی قوانین وغیرہ کو الگ مباحث کے طور پر پڑھایا جائے۔ نیز اصول فقہ بھی جدید انداز میں پڑھایا جائے ' اور فقہ کو منضبط (Codify) کیا جائے۔ آج عدلیہ کے لیے ایسے افراد ناگزیر ہیں جو علوم دین کے ماہر ہوں اور فقہ کو جدید انداز میں سمجھتے ہوں۔

منطق میں نصابی کتب دور از کار بحثوں پر مشتمل ہیں ' اور طلبہ کی صلاحیتوں کا ایک بڑا حصہ ان کتب کو محض سمجھنے پر صرف ہوتا ہے ' جبکہ اس منطق کی پوری عملی زندگی میں کہیں ضرورت نہیں پڑتی۔ اسی طرح یونانی فلسفہ بھی ایک قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ چنانچہ منطق و فلسفہ دونوں یکسر ختم کر دیے جائیں۔ ان کی جگہ اسلام اور سائنس کا مضمون متعارف کرایا جائے ' جس میں سائنس ' اس کے اصول ' سائنسی قوانین و نظریات ' سائنسی ایجادات وغیرہ کا مختصر اور آسان تعارف کرایا جائے۔ قدیم مسلمان سائنس دانوں کی خدمات کا جامع تذکرہ بھی ہو۔

صرف و نحو کی کتب بلاشبہ نہایت مفید ہیں ' لیکن ان میں گرامر کی بجائے گرامر کے فلسفے کو اہمیت دی گئی ہے۔ نہایت سائنٹیفک انداز میں مرتب کردہ جدید کتب سے استفادہ کیا جانا چاہیے ' مثلاً النحو الواضح ، البلاغہ الواضح اسی طرح کافیہ اور شرح جامی کی جگہ المغنی یا ابن عقیل وغیرہ شامل کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح ' عربی ادب و بلاغت کی نصابی کتب میں سے مقامات حریری کو خارج کیا جا سکتا ہے۔ ان کی جگہ جدید عربی لٹریچر میں سے کوئی کتاب شامل کی جائے۔ عربی بول چال اور تحریر کو بنیادی اہمیت حاصل ہو۔ کتنی بدقسمتی ہے کہ ہمارے علماکرام عربی زبان کے ماہرین ہونے کے باوجود عربی میں ایک جملہ بھی بولنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اساتذہ و طلبہ عربی رسائل و جرائد کے مطالعے ' کی عادت بنائیں ' اور کمرہ جماعت کی زبان عربی ہو۔

علم کلام کے ذریعے جن فرقہ باطلہ کا رد و استیصال سکھایا جاتا ہے ' ان کا اب کہیں وجود نہیں۔ چنانچہ اب اس مضمون کو اسلام اور مذاہب عالم کا نام دے کر اس کے ذریعے عیسائیت ' یہودیت ' بدھ مت ' ہندومت ' کمیونزم ' سرمایہ دارانہ نظام ' صیہونیت ' قومیت پرستی وغیرہ کا تقابلی جائزہ ' اور موجودہ فتنوں مثلاً انکار حدیث ' قادیانیت وغیرہ کا رد سکھایا جائے۔

انگریزی زبان کے غلبہ و حاکمیت سے انکار و مفر ممکن نہیں۔ قدیم دور میں علمائے کرام نے یونانی زبان کو رد کرنے کے بجائے اس میں مہارت حاصل کی ' اور یونانی علوم کو عربی میں منتقل کیا۔ آج علوم

کی زبان انگریزی ہے۔اس سے راہ فرار اختیار کرنے کی بجائے ضروری ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کو اس کی تعلیم دی جائے۔ایک عملی صورت یہ ہے کہ فارغ التحصیل حضرات کے لیے کم ازکم دو سالہ نصاب انگریزی شروع کیا جائے۔

ہمارے علمائے کرام عالم اسلام کے بڑے بڑے مسائل سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتے۔ ضروری ہے کہ طلبہ کو سبقاً سبقاً عالم اسلام کے سیاسی ' معاشی و معاشرتی احوال سے آگاہ کیا جائے۔پھر بالخصوص مطالعہ پاکستان کو اسی طرح نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

تاریخ اسلام ' بالخصوص سیرت النبی اور تاریخ خلافت راشدہ کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔اسی طرح حضرات انبیاکرام سے دور حاضرہ تک تاریخ دعوت کو نصاب کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔

ساتویں سال اسلامی نظریہ حیات کو اس انداز میں پڑھایا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ' مبادیات معاشیات کی تشریح و توضیح کے ساتھ ' اسلام کا سیاسی نظام ' جدید سیاسی نظریات کے تقابل کے ساتھ ' اسلام کا معاشرتی نظام ' جدید معاشرتی افکار کے ہمراہ ' بالکل واضح ہو جائے ' طلبہ کو اسلام کی جامعیت اور اس کے کامل ترین ضابطہ حیات ہونے کا کماحقہ علم حاصل ہو اور وہ پڑھے لکھے طبقہ میں اسلامی نظام کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح اجاگر کر سکیں۔نصاب کی تبدیلی کا یہ عمل بذریعہ وفاق ہائے مدارس عربیہ اگر ہو گا تو اپنی نتیجہ خیزی اور قبولیت کے لحاظ سے زیادہ بہتر رہے گا۔

درس نظامی کی بیش تر کتب قدیم طرز تحریر اور انداز میں طبع ہوتی ہیں۔اسی طرح حواشی در حواشی کے سلسلے کی صورت میں کتاب کی ایسی صورت بن جاتی ہے کہ اس سے استفادہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ان کتب کو نئے سرے سے طبع کروایا جائے۔ تمام حواشی کو ترتیب وار ' صفحہ نمبر اور حوالہ نمبر کے ساتھ کتاب کے آخر میں یکجا کر کے شامل کر دیا جائے۔نیز قدیم کتب کی تبویب کی جائے ' اور ہر باب کے آخر میں سوالات اور تمرنیات کو تحریر کیا جائے۔اسی طرح ان مضامین پر کتابیں تیار کی جائیں جو پہلے شامل نصاب نہیں۔مثلاً اسلام اور سائنس اور اسلامی نظریہ حیات وغیرہ۔

پہلے سال سے ہی اساتذہ باقاعدہ نوٹس لکھوائیں اور طلبہ کو ہوم ورک دیا جائے مضامین اور مقالے لکھنے کا۔اس طرح طلبہ میں تحریر کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ ہمارے مدارس میں کتب خانے منظم اور بھرپور نہیں۔بعض جگہ صرف کتابوں کے قدیم اور بوسیدہ نسخے موجود ہیں ' جبکہ کتابوں کی تعداد انتہائی قلیل ہے۔کتب خانے ' مدارس کا جزو لاینفک ہیں۔ضروری ہے کہ مدارس انھیں از سرنو ترتیب دیں ' کتب میں اضافہ ' اور انھیں دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ' کیا جائے۔

سال میں ایک مرتبہ تعلیمی سیاحت کو بھی رواج دیا جائے۔اس طرح علمی معلومات میں بھی اضافہ

ہو گا اور طلبہ میں وسعت نظر بھی پیدا ہوگی ۔ نیز تفریح کے فطری تقاضے کو بھی مثبت انداز میں پورا کیا جا سکے گا ۔ بیش تر دینی مدارس میں صباحی خطاب (اسمبلی) کا کوئی اہتمام نہیں ۔ مناسب رہے گا کہ اگر صبح کا آغاز اجتماعی شکل میں کیا جائے ۔

جس طرح کالجز میں این سی سی کی ٹریننگ کا سلسلہ ہے ' اسی طرح دینی مدارس کے لیے بھی یہ سہولت حاصل کی جائے تاکہ دینی مدارس کے طلبہ جہاد کی عملی مشق حاصل کر سکیں ۔

یورپ و امریکہ وغیرہ میں ہفتہ میں ایک روز عملی کام یا فیلڈ ورک شامل نصاب ہوتا ہے ۔ دینی مدارس کے طلبہ بھی مہینہ میں دو مرتبہ عملی کام کریں ۔ ان کاموں میں خود مدرسے کے کام ' کھیتی باڑی ' رنگ و روغن ' تعمیر و مرمت ' یا فیلڈ میں دعوت و تبلیغ اور خدمت خلق کے کام شامل ہو سکتے ہیں ۔ اس طرح طلبہ مستعد رہیں گے ۔ ان کی صحت بھی بہتر ہوگی ۔ ان سے روایتی سستی و کاہلی اور آرام طلبی کے طعنے بھی دور ہو سکیں گے ۔

ماحول بھی تعلیمی پروگرام پر مثبت و منفی دونوں نقوش ڈالتا ہے ۔ دینی مدارس کے ماحول کو بھی اسی نقطہ نظر سے ترتیب دینا چاہیے کہ طلبہ میں صحت مند خیالات پرورش پائیں اور ان کی سیرت و کردار کی اسلامی سانچے میں تعمیر ہو ۔ مثلاً ' مدرسہ کی عمارت کھلی ' ہوادار اور صاف ستھری ہو ۔ تنگ و تاریک اور پرگھٹن ماحول میں پرورش پانے والے ذہنوں میں بھی تنگ نظری ' تاریکی اور گھٹن پیدا ہو جاتی ہے ۔ طلبہ میں صفائی کے مقابلے کروائے جائیں ' ان کے کمرے صاف ستھرے ہوں ' بستر ترتیب وار ہوں ' کپڑے صاف اور اجلے ہوں ' جوتے پالش ہوں ـــــ یہ چیزیں ایمان کا حصہ ہیں لیکن انھیں دینی مدارس کے طلبہ نے اپنے لیے شجر ممنوعہ سمجھ رکھا ہے ۔